معز امجد

دینی تعلیم کی درس گاہیں

نصاب، طریق تدریس اور طلبہ کی اخلاقی تربیت

علوم وفنون کی تدریس میں نقائص

دینی مدارس میں علوم وفنون کی تدریس کے لیے جو نصاب رائج ہے، اس میں عام طور پر، عربی یا فارسی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ایک ایسے طالب علوم کو جو بالعموم، اردو زبان بھی بہت اچھی طرح سے نہیں جانتا، صرف، نحو، منطق، فلسفہ، ادب، بلاغت اور اس طرح کے بے شمار دوسرے فنون عربی یا فارسی زبان میں پڑھا دیے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ، ظاہر ہے، یہی نکلتا ہے کہ طلبہ، فنون پر توجہ دینے کے بجائے زبان ہی کے مسائل حل کرتے رہ جاتے ہیں۔

مزید براں، علوم وفنون کی تعلیم کے لیے، ان مدارس کے نصابات میں جو کتابیں شامل ہیں، ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سادہ اور عام فہم بات کو بھی مشکل پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ زمانے کی کروٹوں نے طرز تحریر پر اتنا کچھ اثر ڈالا ہے کہ آج یہ کتابیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انہیں لکھنے والوں کے پیش نظر، دوسروں تک اپنی بات کا ابلاغ کبھی تھا ہی نہیں۔ ان میں سادہ عبارتوں کو مغلق، اور عام فہم حقائق کو پیچیدہ بنا کر لکھا گیا ہے۔ چنانچہ، اکثر کتابوں کی شروح کو پڑھنا، جو بالعموم اسی طرز پر لکھی جاتی ہیں، ناگزیر ہوتا ہے۔ غرض، طالب علم انہی کتابوں کی بھول بھلیوں میں الجھا رہتا ہے اور اپنا اکثر وقت فنون سیکھنے کے بجائے کتابوں کی عبارتیں حل کرنے ہی میں صرف کر دیتا ہے۔

ایسی کتابیں پڑھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ تعلیم سے فارغ ہو جانے کے بعد، دین کے یہ عالم، جب مسجد ومنبر اور مکتب ومدرسہ سنبھالتے اور عام آدمی تک دین کا پیغام پہنچانے کا کام شروع کرتے ہیں تو ان کی اپنی گفتگو کا انداز بھی، بالعموم، ان درسی کتابوں جیسا ہی ہوتا ہے۔ لب ان کے فرامین سمجھنے کے لیے بھی عام آدمی شارحین کا محتاج ہوتا ہے۔

دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن مدظلہ اس مسئلے پر اپنی ایک تقریر میں

فرماتے ہیں :

"ہمارا نصاب تعلیم کچھ تغیرات کے باوجود بڑی حد تک انہیں کتابوں پر مشتمل ہے جنہیں ملا نظام الدین سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ھ) نے منتخب کیا تھا۔ یہ کتابیں متاخرین کی مرتب کردہ ہیں اور ان میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اختصار کے ساتھ کتاب اپنے موضوع کے تمام مباحث ومسائل وجزئیات پر محیط ہو تا کہ طالب علم زیر درس موضوع کی تمام بحثوں پر مطلع ہو جائے۔ یہ باکمال مصنفین اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں مگر اختصار کے سبب ان کتابوں میں جگہ جگہ تعقید اور اغلاق کی نوعیت پیدا ہو گئی ہے اور اسی مشکل نے ایک نئی ضرورت کی طرف متوجہ کیا کہ ان مختصرات کے متون کی تشریح وتحلیل کی جائے۔ پھر یہ کہ متن کی تشریح وتحلیل کے عمل میں ضروری ہوگا کہ لغت، نحو، صرف اور بلاغت کے اصول سے کام لیا جائے اور ان کو منطبق کر کے مختصر عبارت کو قابل استفادہ بنایا جائے۔ اس طرح عبارت کے تجزیہ سے طالب علم کا ذہن مسئلہ کی مکمل صورت کو مجموعی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ یا یوں کہئے کہ زیر بحث موضوع کا احاطہ، یا اس موضوع پر فکر میں بالیدگی اور جلا کی شان پیدا کرنے میں یہ طریق درس ناکام ہے۔ مگر دوسری طرف اس کا زبردست فائدہ یہ ہے کہ اس سے عبارت سمجھنے کی قوت، نقد وتبصرہ کی صلاحیت، تحلیل وتجزیہ کا سلیقہ اور مشکلات کو حل کرنے کا قابل قدر ذوق پیدا ہوتا ہے۔ ایسی استعداد کے حامل طلبہ جب ان مطولات کا ازخود مطالعہ کرتے ہیں جن میں علمی مسائل اور بحثوں کو بسط وسلاست کے ساتھ تحریر کیا گیا ہو تو انہیں زبردست فائدہ ہوتا ہے اور وہ تبحر کی شان پیدا کر لیتے ہیں۔

اس کے برخلاف ایک دوسرا طریقہ تعلیم ہے جو اس دور میں رائج ہے کہ موضوع سے متعلق ایسی آسان اور سلیس کتابوں کا انتخاب کیا جائے جن میں عبارت فہمی کے لیے تحلیل وتجزیہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ آسانی کے ساتھ مسائل کی مکمل تصویر ذہن نشین ہو جائے۔ یہ طریق درس، موضوع پر احاطہ کی صلاحیت پیدا کرنے کے سلسلے میں یقیناً کامیاب ہے لیکن تعلیم کا تجربہ رکھنے والے، اپنے تجربات کی روشنی میں عبارت فہمی، دقیقہ رسی اور مشکلات پر عبور کے سلسلے میں اس طریقہ کو ناکام سمجھتے ہیں" (ماہنامہ دار العلوم، جولائی ۱۹۹۴ء، ص ۲۴)

اس اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس طرح کی کتابیں پڑھانے کا مقصد، دراصل طلبہ کو فن میں ماہر بنانا نہیں بلکہ انہیں مشکل عبارتیں حل کرنے کی تربیت دینا ہے۔ یہ بات مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فن کی تعلیم کے لیے، یہ کتابیں بہت فائدہ مند نہیں ہیں، اس معاملے میں آسان اور سلیس زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کا انتخاب زیادہ نفع بخش ہوگا۔ تاہم مشکل کتابیں پڑھ لینے کے بعد آسان کتابوں سے فنون سیکھنا، طلبہ کے لیے کچھ مشکل نہیں رہتا۔ یہ کام، وہ ازخود کر سکتے ہیں۔

یہ گویا ایسی ہی بات ہے کہ چھٹی یا ساتویں جماعت کے طلبہ کو سائنس کی تعلیم دینے کے لیے، سائنس کی امہات کتب میں سے کوئی کتاب، نصاب میں شامل کر لی جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ طلبہ، سائنس کا علم حاصل کریں یا نہ کریں، کم از کم اس کی کتابیں پڑھنا ضرور سیکھ لیں گے۔ اس مرحلے کے بعد، ان میں سے جو چاہے گا، آسان کتابوں سے اردو سائنس کی تعلیم حاصل کر لے گا۔ کیا یہ منطق قابل قبول ہوگی؟ کیا اس طریق تدریس کے نتیجے میں طلبہ سائنس ہی سے متنفر نہیں ہو جائیں گے؟

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ کتابیں پڑھ کر، جن مشکلات کو حل کرنے کی استعداد طالب علم میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ قرآن وسنت کے فہم میں حائل ہونے والی مشکلات نہیں ہیں۔ یہ، دراصل، ایک خاص زمانے میں لکھی ہوئی کتابوں کو سمجھنے کی مشکلات ہیں۔ بالفاظ دیگر، یہ ایک خاص زمانے کے طرز تحریر اور اس کے علم کلام کو سمجھنے کی مشکلات ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک عالم کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ یہ تمام کتابیں پڑھ سکتا ہو، لیکن کیا یہ صلاحیت پیدا کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا؟ عبارتیں حل کرنے کی تعلیم دینے کے لیے بہت سے دوسرے طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو اس طرح الجھانا ہرگز ضروری نہیں ہے کہ اصل علم کا ایک بڑا حصہ بے کار بحثوں میں ضائع ہو جائے۔ مثال کے طور پر منطق کی کتابوں پر نظر ڈالیے۔ ظاہر ہے، منطق پڑھانے کا اصل مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ طالب علم کو غور وفکر کرنے کے اس طریقے سے آگاہ کیا جائے جسے منطقی Logical کہتے ہیں۔ لیکن اسے پڑھانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس میں اس کا اصل مقصد بہت پیچھے رہ جاتا اور طالب علم کی ساری توجہ، کتاب کی عبارتیں حل کرنے ہی پر مرکوز رہتی ہے۔ اس کے معنی، دراصل یہ ہیں کہ وہ منطق کی کلاس میں منطق کی تعلیم حاصل کر ہی نہیں رہا، یہاں تو وہ محض عبارتیں حل کرنا سیکھ رہا ہے۔ منطق کا اصل علم، اس نے بعد میں، از خود،

حاصل کرنا ہے۔

ہمارے نزدیک، اس مسئلے کا ایک آسان حل یہ ہو سکتا ہے کہ علوم وفنون کی تعلیم کے لیے ایسی ہی کتابیں نصاب میں شامل کی جائیں جو آسان اور سلیس زبان میں ہونے کے ساتھ ساتھ، عصری اسلوب میں لکھی گئی ہوں۔ اس کے نتیجے میں طلبہ کے لیے علوم وفنون کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ ان علوم وفنون کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد، آخری سال میں، اب ایسا مضمون نصاب میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کا مقصد صرف علمائے سلف کے طرز تحریر کو سمجھنے اور ان کی عبارتوں کی مشکلات حل کرنے کی تعلیم دینا ہو۔

طریق تدریس سے متعلق خامیاں

ہمارے دینی مدارس میں، بالعموم، تدریس کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اس میں طلبہ درسی کتابیں پڑھتے اور اساتذہ انہیں سنتے ہیں۔ اس دوران میں، طلبہ کی غلطیوں کی تصحیح اور مشکلات کے حل میں رہنمائی دی جاتی ہے۔ کسی کسی موقع پر، استاد درس سے متعلق ان سے سوالات بھی پوچھ لیتے ہیں۔

اس طریق تدریس میں سارا علم کتاب ہی سے اخذ کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، وہ مخصوص درسی کتاب ہی علم کی حدود وقیود طے کر دیتی ہے۔ اس سے باہر، طلبہ جاتے ہیں نہ استاد۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بارہ بارہ سال تک سر کھپانے کے بعد محض چند کتابوں کا علم حاصل ہو پاتا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ چند کتابوں کے علم اور نفس مضمون کے علم میں بڑا فرق ہے۔ مثال کے طور پر علم تفسیر کے درس میں جلالین اور بیضاوی جیسی کتابوں کا علم تو طلبہ کو کچھ نہ کچھ حاصل ہو جاتا ہے، مگر علم تفسیر کی انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس سے وہ ناآشنا ہی رہتے ہیں۔ یہی معاملہ نحو، بلاغت، فلسفہ اور دوسرے علوم وفنون کا بھی ہے۔

اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہمارے نزدیک کتابوں کے ذریعے سے تعلیم دینے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ علوم وفنون کے معاملے میں، محض کتابیں پڑھ لینے سے علم حاصل نہیں ہوتا۔

علوم وفنون کی تدریس میں بالعموم تین طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک محاضراتی، دوسرے بحث وتمحیص اور تیسرے عملی تطبیق کا طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

محاضراتی طریقے (Lecture Based Teaching) میں استاد لیکچر دیتا ہے۔ طلبہ اسے سنتے اور ضروری باتیں، یادداشتوں کے طور پر نوٹ کر لیتے ہیں۔ اس طریقے سے استاد

ہی مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ زیر درس علم وفن کے بارے میں اپنے مطالعہ اور تجربات کا نچوڑ طلبہ کے سامنے رکھ دے۔ طلبہ کے نقطہ نظر سے یہ طریقہ بہت آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن مجرد اسی طریقے کا استعمال طلبہ کی قوت مطالعہ کے لیے بہت مضر ہو سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مطالعہ کرنے کی عادت اور اس کا شوق بالکل ختم ہو سکتا ہے اور طلبہ میں علم کے لیے محنت اور جستجو کا رجحان بالکل تباہ ہو سکتا ہے۔

دوسرا طریقہ بحث وتمحیص کا ہے۔ اس کے تحت طلبہ متعلقہ کتابیں پڑھ کر ان کی عبارتوں کی صرفی ونحوی مشکلات حل کر کے، معاجم اور لغات کی مدد سے الفاظ کے معانی طے کر کے اور عبارتوں کے مفہوم بھی خود ہی متعین کر کے آتے ہیں۔ کلاس کے اندر کتابیں پڑھنے کی بجائے نفس مضمون پر بحث ہوتی ہے۔ طلبہ، اپنے فہم کے مطابق مسائل پر گفتگو کرتے، اس کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے اور اپنے مطالعے کے نتائج کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ یہ سارا کام استاد کی رہنمائی ہی میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی توجہ طلبہ کی باقی رہ جانے والی مشکلات کو حل کرنے اور ان کے فہم کی غلطیوں کی اصلاح کرنے پر مرکوز رکھتا ہے۔ اس طریقے سے طلبہ کی قوت مطالعہ ابھرتی اور ترقی کرتی ہے۔ مزید برآں کوئی نئی کتاب یا عبارت ان کے سامنے آ جائے تو اس کا مفہوم متعین کرنے کی انہیں تربیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن مجرد اس طریقے کو استعمال کرنے سے بہت سا وقت ضائع ہو سکتا ہے۔ اگر طلبہ کو مضمون کے تعارف کے بغیر اس طریقے کو اختیار کیا جائے تو اس کے نتیجے میں بحث کا دائرہ محدود رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے پہلے استاد زیر بحث موضوع کا مختصر تعارف طلبہ کے سامنے پیش کر دے۔

تیسرا طریقہ عملی تطبیق (Practical Application) کا ہے۔ اس کے تحت طلبہ ان اصول وقواعد کو استعمال میں لا کر عملی مسائل کا حل دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طریقے کو Case Study Method بھی کہا جاتا ہے۔ مختلف کیسز طلبہ کو حل کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ مقررہ تاریخ پر تمام طلبہ اپنے اپنے مجوزہ حل استاد کے پاس جمع کراتے ہیں۔ اس کے بعد تمام مجوزہ حل کلاس میں زیر بحث لائے جاتے ہیں اور ان پر نقد وتبصرہ کیا جاتا ہے۔ تجویز پیش کرنے والا اپنے حل کا دفاع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طریقے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں طلبہ زندگی کے حقیقی مسائل میں ان اصول وقواعد کی عملی تطبیق کی تربیت بھی پاتے ہیں جنہیں وہ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اس لحاظ

سے طلبہ کی آئندہ علمی و عملی زندگی کے لیے بظاہر یہی طریقہ سب سے زیادہ فائدہ مند لگتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس طریقے کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اسے اسی وقت استعمال کیا جا سکتا ہے جب طلبہ کو کسی معاملے میں اصول و قواعد کی تعلیم دی جا چکی ہو۔ اس سے پہلے یہ طریقہ بہت زیادہ نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر یہ طریقہ اصول و قواعد کی عملی تطبیق کی تربیت کے لیے تو بے شک سب سے بہتر ہے مگر بالعموم ان اصول و قواعد کی تفہیم کے لیے اسے استعمال کرنا کچھ مشکل ہے۔

ہمارے نزدیک طلبہ میں بہترین صلاحیتیں پیدا کرنے کے لیے تدریس کے یہ تینوں طریقے ایک خاص ترتیب کے ساتھ استعمال میں لانے چاہئیں۔ کسی نئے فن یا مضمون کے تعارف کے لیے سب سے پہلے محاضراتی طریقہ ہی اختیار کرنا چاہئے۔ ان محاضرات ہی میں اس فن کی اہم اصطلاحات اور اس کی امہات کتب کا تعارف بھی کرا دینا چاہئے۔ اس کے بعد اس فن کے اہم مباحث اور ان کے اجزاء کا بھی ایک ترتیب کے ساتھ' تعارف کرا دینا چاہئے۔ یہ مرحلہ طے کر لینے کے بعد بحث و تمحیص کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس کے تحت طلبہ کو مطالعے کے لیے اس فن کی چند اہم کتابوں سے کام دیا جا سکتا ہے۔ یہ کام بنیادی طور پر مطالعاتی منصوبوں (Study Projects) کی نوعیت کا ہونا چاہئے۔ طلبہ کو چھوٹے چھوٹے موضوعات پر تیاری کر کے ان موضوعات پر مباحثوں اور لیکچرز کی تیاری کرائی جائے۔ مقررہ تاریخ میں طلبہ کلاس کے اندر مباحثوں اور لیکچرز کی صورت میں اپنا نقطہ نظر بیان کریں اور اپنے نقطہ نظر کا کلاس کے سامنے دفاع کریں۔ یہ دونوں طریقے اگر صحیح طرح سے عمل میں لائے جائیں تو اس کے نتیجے میں طلبہ ایک فن کے اصول و قواعد کو بڑی اچھی طرح سے جان لیں گے۔ اس کے بعد جس فن کے لیے ضروری سمجھا جائے' اس میں عملی تطبیق کی تربیت کے لیے Case Study کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

طلبہ کی تربیت کے پہلو سے خامیاں

اس وقت ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر جس اخلاقی پستی کا شکار ہے' دینی مدارس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ عام لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو دینی مدارس کے طلبہ اور اس سے فارغ ہونے والے علمائے دین کا حال بھی کوئی بہت اچھا نہیں ہے۔ وہ اپنے روز مرہ کے معمولات میں دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں تو یہ بھی اس معاملے میں کچھ زیادہ پیچھے نہیں ہیں۔ وہ اگر مفاد پرستی کا شکار ہیں تو ان میں بھی بے لوث خدمت کرنے والوں کی تعداد کوئی زیادہ نہیں ہے۔

ان کے لینے اور دینے کے باٹ اگر الگ الگ ہیں تو یہ بھی اپنے معاملات میں بہت زیادہ راست نہیں ہیں۔ وہ جذبات میں آکر اگر بد زبانی کر بیٹھتے ہیں تو اس معاملے میں ان کے اخلاق بھی کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کرتے۔ غرض کہ عام آدمی نے اگر پیغمبر کے اسوہ کو فراموش کر دیا ہے تو پیغمبر کے ان نام لینے والوں اور خدمت دین کا لبادہ اوڑھنے والوں نے بھی آپ ﷺ کو اپنا آئیڈیل نہیں بنایا۔

اسلامی دنیا کے جرائد واخبارات میں وقتاً فوقتاً دینی مدارس میں اخلاقی تربیت کے فقدان اور ان سے فارغ ہونے والے افراد کی پست اخلاقیات پر نکتہ چینی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دینی مدارس کی طرف سے بالعموم دو قسم کے رویے سامنے آئے ہیں۔ کچھ لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ اخلاقی پستی یقیناً عام لوگوں کا مسئلہ تو ہے مگر دینی مدارس سے فارغ ہونے والے افراد کا مسئلہ ہرگز نہیں ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ دینی مدارس میں طلبہ کی ایسی شان دار تربیت کی جاتی ہے کہ اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ بہترین اخلاق کا نمونہ اور معاشرے کے عام لوگوں کے لیے ایک شان دار اسوہ ہوتے ہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کاروں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اس کے برعکس کچھ لوگ یہ اعتراف تو بہرحال کرتے ہیں کہ ان مدارس سے نکلنے والے طلبہ کا اخلاق وکردار مطلوبہ معیار سے بہت نیچے ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ اصرار کرتے ہیں کہ معاشرے کے ارباب سیاست، اس کے اہل اقتدار، اس کے ارباب حل وعقد، اس کے لیڈروں، اس کے منتظمین اور اس کے اہل شوکت کے مقابلے میں ان طلبہ کے اخلاق وکردار کا معیار بہرحال بہت بلند ہے۔

جہاں تک پہلے نقطہ نظر کا تعلق ہے، اس کی غلطی جاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ ان مدارس کے کسی طالب علم یا اس سے فارغ التحصیل کسی "عالم دین" کے کسی نقطہ نظر پر تنقید کر دیجیے، اس کے ساتھ کسی علمی مباحثے میں حصہ لے لیجیے یا اصلاح کے کسی پہلو پر اسے توجہ دلا دیجیے۔ اس کے نتیجے میں بالعموم آپ کے سامنے اخلاق وکردار کا ایسا نمونہ پیش ہوگا جس کی پیروی آپ کے لیے ممکن ہوگی اور نہ پسندیدہ۔

فان کنت لا تدری فتلک مصیبة
وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

"اگر تم نہ سمجھو تو یہ بھی ایک مصیبت ہے۔ لیکن اگر تم سمجھتے ہو (اور پھر یہ رویہ

اپنائے ہوئے ہو) تو مصیبت بہت بڑی ہے"

اس کے برعکس، دوسرا نقطہ نظر اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ان مدارس سے نکلنے والے لوگوں سے اخلاق و کردار کے معاملے میں وہی معیار مطلوب ہے جس کی توقع معاشرے کے ڈاکٹروں، انجینئروں، وکیلوں، سیاست دانوں اور ارباب حل وعقد سے کی جاتی ہے۔ وہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ دین کے یہ عالم دراصل زمین کے نمک ہیں، دنیا کے نور ہیں اور اخلاق و کردار کی اس تاریکی میں رہنمائی کے چراغ ہیں۔ جنھوں نے دنیا کے لیے معیار بننا ہے، آخر وہ اپنے آپ کو دنیا کے معیار پر کیسے پرکھ سکتے ہیں؟ جن کے وجود سے دنیا نے روشنی پائی ہے، آخر وہ دنیا کی تاریکیاں اپنے اندر کیسے سمیٹ سکتے ہیں؟ جن کے وجود سے دنیا نے دوسروں پر دین حق کی وضاحت اور دنیا کی رہنمائی کا کام کرنا ہے، آخر وہ دوسروں سے اپنا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟

معاشرے کا حال جو بھی ہو، دین کے کسی عالم اور داعی کو جب بھی پرکھا جائے گا، اعلیٰ ترین معیار پر ہی پرکھا جائے گا۔ اس راہ کا مسافر بننے سے پہلے، آدمی کو بہت اچھی طرح سے سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ یہ راہ اختیار کر کے، وہ اپنے آپ کو معاشرے کی تنقید کا ہدف بنا رہا ہے۔ پورا معاشرہ، اپنی آنکھ کے شہتیر سے تو صرف نظر کر لے گا، مگر اس کی آنکھ کا تنکا اسے کبھی چین نہ لینے دے گا۔ دنیا میں دین کے کسی عالم یا داعی کے لیے اگر کوئی معیار ہو سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف اس ہستی کا ہو سکتا ہے جس کے بارے میں عالم کے پروردگار کا فرمان ہے

انک لعلی خلق عظیم (القلم ۶۸: ۴)

"اے پیغمبر، بے شک تم اخلاق کے اعلیٰ ترین معیار پر ہو"

سخت ترین حالات میں پوری استقامت کا مظاہرہ کرنا، دوسروں کے سب وشتم کے جواب میں مسکرا دینا، علمی اختلافات کو خوش دلی سے برداشت کرنا، نفرتوں کا جواب محبت سے دینا، دوسروں کی غلطیوں اور خطاؤں پر عفو ودرگزر سے کام لینا، کفر وفسق کے فتووں پر اپنی زبان بند رکھنا، مجادلوں اور مناظروں سے گریز کرنا، کسی کی دل آزاری نہ کرنا، کسی کے ساتھ ترش روئی سے بات نہ کرنا، اپنی غلطیاں مان لینا، لوگوں کے دکھ سکھ میں ان کا ساتھی بننا، ان پر تنقید کے بجائے انھیں نصیحت کرنا، اپنے لیے سخت ترین اور دوسروں کے لیے نرم معیار رکھنا، بے شک، یہ سب کچھ آسان نہیں ہے۔ اپنے رب کے ساتھ مضبوط تعلق اپنے پیغمبر کے ساتھ بے پناہ محبت، ذمہ داری اور روز قیامت کی جواب دہی کے زندہ احساس اور دل

میں اپنے بھائیوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی تڑپ کے بغیر' اخلاق وکردار کا یہ معیار حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ بد ترین حالات میں اخلاق وکردار کے اس اعلیٰ مقام پر برقرار رہنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دل نصرت دین کے جذبے سے سرشار ہو اور اللہ کے دین کے لیے اپنی جان' مال اور آبرو کی قربانی کو قابل فخر سمجھا جائے۔

یہ واقعہ ہے کہ امت کی تاریخ میں اخلاق وکردار کے لحاظ سے کمزور لوگوں پر علم دین کے معاملے میں کبھی اعتماد نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے اوراق جن علماء کے ناموں سے روشن ہیں' وہ محض علم ہی کی بلندیوں پر فائز نہیں تھے' اپنے اخلاق وکردار میں بھی آسمان کے ستارے تھے۔ شدید مصائب کے مقابلے میں ان کی ثابت قدمی اور عزیمت کی داستانیں' تاریک راتوں میں روشن قندیلیں ہیں۔

شدید گرمی کے موسم میں سعید بن مسیب کو کھجور کے درخت سے باندھ کر درے مارے جا رہے ہیں۔ ان کی پیٹھ لہولہان ہو گئی ہے۔ وہ بھوک' پیاس اور تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ان پر پانی ڈال کر ہوش میں لایا گیا ہے۔ مگر ان کی زبان' اعلان حق میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم ہے۔

انس کے بیٹے مالک کی مشکیں کسی جا رہی ہیں۔ ان کی پیٹھ پر تازیانے برس رہے ہیں۔ مگر وہ بادشاہ وقت کے فرمان کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ ان کی مشکیں اور زور سے کسی جاتی ہیں۔ ان کے دونوں بازو اکھڑ گئے ہیں۔ ان کا چہرہ کرب والم کی داستان سنا رہا ہے۔ مگر ان کی زبان اب بھی وہ کہنے کو تیار نہیں' جو حاکم وقت ان سے کہلانا چاہتا ہے۔ لب' ایک نیا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اونٹ کی برہنہ پیٹھ پر سوار کر کے' انہیں شہر کا گشت کرایا جا رہا ہے۔ شاید' یہ تذلیل وہ برداشت نہ کر سکیں۔ ان کی زبان کھلتی ہے۔ آواز نکلتی ہے: جو مجھے جانتا ہے' وہ تو مجھے جانتا ہے۔ جو مجھے نہیں جانتا' وہ جان لے کہ میں انس کا بیٹا مالک ہوں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ طلاق مکرہ کوئی چیز نہیں ہے۔ (طلاق مکرہ ایسی طلاق کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص کو مجبور کر کے' اس سے طلاق کا لفظ کہلوایا گیا ہو)

معتصم باللہ کے دربار سے احمد بن حنبل کو زنجیروں میں جکڑ کر نکالا گیا ہے۔ انہیں بہت سے جلاد باری باری تازیانے لگا رہے ہیں۔ ان کا پورا جسم لالہ رنگ ہو گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود جس مسئلے کو وہ کتاب وسنت کے خلاف سمجھتے ہیں' اس کا اقرار کرنے پر ان کی زبان آمادہ نہیں ہوتی۔

دیکھ لیجئے، یہ سب لوگ اپنے اخلاق وکردار ہی میں ایسے اعلیٰ مقام پر فائز نہیں ہیں، اس کے ساتھ ساتھ، دین کی نصرت کا جذبہ بھی ان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے وقت کے حاکموں کے سامنے، یہ سوچ کر سر جھکانے سے انکار کر دیا کہ جب کائنات کے بادشاہ سے ملاقات ہوگی تو اسے کیا منہ دکھائیں گے۔ ان کی زبان یہ سوچ کر موافقت سے گریز کرتی رہی کہ ان کا یہ عمل کہیں لوگوں کو دین کے علما اور بالآخر دین ہی سے بیزار کرنے کا باعث نہ بن جائے۔ انہوں نے دنیا کے جابروں کے ظلم وستم کو یہ سوچ کر برداشت کر لیا کہ کہیں وہ اپنی ہی نظروں میں نہ گر جائیں۔ ایسے ہی لوگوں سے ہر زمانے میں دنیا والوں نے روشنی پائی ہے۔ یہ روشنی کے وہ مینار ہیں جو گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کے لیے مشعل راہ بنے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اپنے زمانے نے بالعموم ان کی قدر نہ کی اور انہیں زندگی میں طرح طرح کے مصائب اور مشکلات ہی کا سامنا رہا، مگر یہ واقعہ ہے کہ دنیا انہی لوگوں کو ہمیشہ یاد رکھے گی، انہیں کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

مثالک خر عینی وذکر خر فمی
وحبک خر قلبی فاین تغیب

"میری آنکھوں میں تمہاری صورت، میرے ہونٹوں پر تمہارا تذکرہ، اور میرے دل میں تمہاری محبت موجود ہے۔ کون کہتا ہے کہ تم موجود نہیں ہو"

یہی وہ کردار ہے جو ایک عالم کو، محض ایک عالم سے بلند کر کے معاشرے کے لیے نمونہ اور آئیڈیل بنا دیتا ہے۔ مگر، وہ جنہیں معاشرے کا آئیڈیل ہونا چاہئے، جب معاشرے ہی کو اپنا آئیڈیل بنا لیں، وہ جنہیں صفائی کا کام سونپا گیا ہو، جب خود گھر میں گندگی پھیلانے لگیں اور وہ جنہیں قوم وملت کی اصلاح کا کام کرنا تھا، جب خود جہالتوں اور گمراہیوں میں پڑ جائیں تو پھر کسی اصلاح اور بہتری کی توقع آخر کس بنیاد پر کی جائے گی؟

اس صورت حال میں یہ ناگزیر ہے کہ دینی مدارس کے ان طلبہ کے سامنے، اخلاق وکردار کے اعلیٰ ترین معیارات مقرر کیے جائیں۔ بہترین اخلاق وکردار کے حامل لوگوں کو ان کا آئیڈیل بنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے نبی کریمؐ، آپ کے صحابہؓ اور امت کے صالحین اور اصحاب عزیمت کی سیرت وکردار کا خاص اس پہلو سے مطالعہ کرایا جائے، اور اس کے ذریعے سے ان کے ذہنوں میں ان بزرگوں کی حقیقی قدر ومنزلت کو اجاگر کیا جائے اور ان کے دلوں میں ان کے ساتھ محبت کے جذبات ابھارے جائیں۔ بہت جلد یہ محبت آپ سے آپ ان

کے اندر بھی اخلاق و کردار کی اس بلندی تک پہنچنے کا جذبہ پیدا کر دے گی کہ

احب الصالحین ولست منهم
لعل اللہ یرزقنی الصلاحا

اس کے ساتھ طلبہ کی عملی تربیت اور تزکیہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انہیں روزانہ صالح علماء کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے کا پابند کیا جائے۔ انہیں ترغیب دی جائے کہ وہ قرآن وحدیث کے ان ارشادات میں خاص طور پر دھیان لگائیں جو اصلاح نفس اور تربیت اخلاق سے متعلق ہیں۔ مزید برآں، دین کی نصرت کا جذبہ بھی ان کے اندر پیدا کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ دین حق کے غلبے کے لیے دعوت وانذار، بہرحال ان کی دینی ذمہ داری ہے۔

(بہ شکریہ "اشراق" لاہور)

تاریخ کے پچھلے ادوار میں ایک فریق اور دوسرے فریق کے درمیان زیادہ تر کمیاتی فرق (Qualitative difference) ہوا کرتا تھا۔ اب اہل مغرب نے ایسا دور تخلیق کیا جب کہ ان کے اور دوسروں کے درمیان کیفیاتی فرق (Quantitave difference) پیدا ہو گیا۔ اس تبدیلی نے اہل مغرب کو دوسری قوموں کے اوپر واضح اور فیصلہ کن فوقیت دے دی۔

ان فروق نے جس طرح حالات کو بدلا، اسی طرح خود انسانوں میں زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔ اب اہل مغرب نئی دریافت کی نفسیات میں جی رہے تھے اور اہل مشرق وراثتی عقیدہ کی نفسیات میں۔ اہل مغرب اجتہادی اوصاف کے مالک تھے اور اہل مشرق تقلیدی اوصاف کے مالک۔ اہل مغرب کے درمیان آزادی تنقید کا ماحول تھا اور اہل مشرق کے یہاں ذہنی جمود کا ماحول۔ اہل مغرب کا قافلہ رواں دریا کی مانند تھا اور اہل مشرق کی جماعت ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند۔ اہل مغرب ایک مقصد کے تحت متحرک ہوئے تھے اور اہل مشرق کے یہاں مقصد کا تصور فنا ہو چکا تھا۔ اہل مغرب کے زندہ اوصاف نے ان کو باہم متحد کر رکھا تھا اور اہل مشرق اپنے زوال یافتہ اوصاف کے نتیجہ میں ان خصوصیات سے محروم ہو چکے تھے جو افراد کو ایک دوسرے سے متحد کرتے ہیں۔ اہل مغرب اس احساس پر ابھرے تھے کہ انہوں نے ایک نئی تہذیب پیدا کی ہے جس کو انہیں سارے عالم تک پہنچانا ہے اور اہل مشرق صرف اس احساس پر زندہ تھے کہ وہ ماضی کے قدیم اثاثہ کے وارث ہیں۔ اہل مغرب اقدام کے جذبات سے بھرپور تھے جبکہ اہل مشرق کی دوڑ کی آخری حد تحفظ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔

(مولانا وحید الدین خان)